Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ناصر عباس نیر کی "راکھ سے لکھی گئی کتاب" کا تجزیاتی مطالعہ

ANALYTICAL STUDY OF NASIR ABBAS NAYYAR'S BOOK "RAAKH SAY LIKHI GAI KITAAB"

***Dr. Shaista Hameed Khan, **Rao Muhammad Umar, ***Nimra Hanif**

Nasir Abbas Nayyar is a renouned critic, researcher and literary figure of this age. His book naming "Raakh say likhi gai Kitaab" presents up social, contemporary awareness. Such problems and behaviour of this age are very beautifully represented in this collection and its main topics or themes are relating with sex, humourous behavioures and symbolism. The symbol of the tree is used as they are representative of life and beautifies the earth as ornaments. In these short stories Nayyar not only talked about tree but also staired on our society as we are cutting them being the humen. This article deals with the discussion about the style and meanings of this craft.

Keywords: Nasir Abbas Nayyar, Short Stories, Symbolism, Urdu, Literature, Sex, humourous, Staire.

ناصر عباس نیر عصر حاضر میں اُردو ادب کے نامور ادیب، نقاد، محقق اور افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا افسانوی مجموعہ "راکھ سے لکھی گئی کتاب" ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا جس میں کل چودہ افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے مختلف موضوعات پر لکھے گئے جن میں گہرا سماجی اور عصری شعور جھلکتا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں سماجی خرافات، جنسی گھٹن، ریاستی جبر، تشدد، جبری پابندیوں، خوف و ہراس، جنسی سراسیمگی، ناانصافی اور طبقاتی کشمکش سمیت ایسے ہی دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق ہمارے معاصر عہد کے موجودہ رویوں سے ہے۔ اس افسانوی مجموعے کی اشاعت پر وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں:

"ایک جو نئی کتاب ہوتی ہے ہر لکھنے والے کے لیے ایک امتحان ہوتی ہے۔ نئی کتاب لانے کا اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ پہلی کتابوں سے مختلف ہونی چاہیے... یہ کتاب جب میں نے سنگِ میل کو دی تو وہ یقیناً اس احساس کے ساتھ دی کہ یہ کتاب پہلی دونوں کتابوں سے مختلف ہے لیکن ایک چیز ہے جس کو کسی لکھنے والے کو مفر نہیں ہو سکتا وہ زمانے کی آگ، پرانے زمانے کی حکایات یا اساطیر کا یا پرانی کہانیوں کا جو تعلق ہے وہ آج کے زمانے کی آگ سے ہے۔ فکشن لکھنے والے کو ایک جرأت مند انسان ہونا چاہیے۔

*Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore
**Ph. D Scholar, Department of Urdu, GC University, Lahore
***Ph. D Scholar, Department of Urdu, GC University, Lahore

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جب وہ دوسروں کی زندگی میں ایک طرح سے مداخلت کرتا ہے تو اس کے پاس جرأت ہونی چاہیے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اکثر لکھنے والے خوف، مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فکشن نگار کا کام ان کی زندگیوں کے اندر داخل ہو کر ان سوالات کا جرأت مندی سے سامنا کرنا چاہیے۔"[۱]

ناصر عباس نیر کے اس مجموعہ کا خاص موضوع "سماج" ہے نیز انسانی استحصال، ریاستی جبر، فطرت پرستی، ناانصافی اور طبقاتی کشمکش جیسے موضوعات شامل ہیں۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال کر کے اس۔"آدم کش" معاشرے کی کج روی کو بیان کیا ہے۔ مزید تقسیم ہند کے کربناک واقعے کا ذکر بھی اُن کے ہاں ملتا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں "جنس" خاص موضوع ہے۔ طنز تو جابجا اُن کے افسانوں میں ملتا ہی ہے وہ طنز کے ذریعے معاشرے کی چولی اُتارتے نظر آتے ہیں۔ حاکم اور محکوم کا چلا آرہا دائمی تسلسل جس میں رعایا کا ہمیشہ استحصال ہوتا ہے اور ظلم و ستم جو محکوم پر ہوتا ہے، اُن کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ اُن کے ہاں "ڈر" اور "خوف" کی مختلف کیفیات کا بیان بڑے اہم موضوعات میں سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی استحصال اور عورت کی آبروریزی بھی اہم موضوع ہیں۔

افسانہ نگار کے لیے علامتی افسانہ لکھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ علامتی افسانہ لکھنے کے لیے افسانہ نگار کو تہذیب و ثقافت، اساطیر اور داستانوں سے مکمل واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔ افسانوی مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں ناصر عباس نیر نے علامتوں کا بہترین انداز میں استعمال کیا ہے۔ اس مجموعہ کا عنوان "راکھ" خود ایک بڑی اور اہم علامت ہے۔ "راکھ" بکھراؤ، تباہی اور خستہ حالی کی علامت ہے۔

ناصر عباس نیر نے اس مجموعے میں "درختوں" کو بھی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ درخت زندگی کی علامت اور زمین کا زیور اور حسن ہوتے ہیں۔ درخت ہمارے لیے زندگی کا باعث ہیں۔ درخت انسانوں سمیت کئی مخلوقات کو زندگیاں فراہم کرنے اور خوراک مہیا کرنے میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ جب کسی درخت کو کاٹا جاتا ہے تو اس صدمے اور ملال کی کیفیت کو مصنف یوں بیان کرتا ہے:

"درخت بیچنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا بیٹا بیچے۔ کون اپنے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے کٹتا دیکھ سکتا ہے۔"[۲]

ناصر عباس نیر یہاں محض درخت کی بات نہیں کر رہے بلکہ وہ اس معاشرے پر بھی طنز کر رہے ہیں کہ ہم انسان ہونے کے باوجود اُن کو کاٹ رہے ہیں جو ہمیں زندگی مہیا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے درختوں کا سہارا لے کر بتایا ہے درخت مشکل وقت میں سہارا بنتے ہیں جبکہ انسان دوسرے انسان کو مشکل میں دیکھ کر دل میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح مصنف اس معاشرے کی شکست و ریخت کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح درخت ایک طرف اچھائی اور سہارے کی علامت ہیں جبکہ دوسری طرف انسان، انسان کے ہی خسارے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔

افسانہ نگار یہاں آدم کش معاشرت پر سیدھا طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب انسان ماحول دشمن ہوتا ہے اور درختوں کو کاٹتا ہے مصنف انسانی روپ میں چھپی حیوانیت کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"جب درخت کٹتا ہے تو سب پرندے بوکھلائے ہوئے ایک عجب ناقابل بیان بے چینی سے اُڑتے ہوئے
کبھی اس درخت کبھی اس درخت پر بیٹھتے، کبھی غول کی شکل میں اُڑنے لگتے۔ وہ سب دل کو چیر ڈالنے
والی آوازوں میں چیخ رہے تھے جیسے کسی شخص کے سامنے اس کا پورا کنبہ ذبح کر دیا گیا ہو۔"۳

یہاں درخت "گھر" کی علامت کے طور پر بھی ہے۔ ایک ایسا گھر جس میں تمام لوگ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت زندگی گزار رہے تھے لیکن اکیسویں صدی کی عالمگیریت اور جدیدیت کے تحت نئی روشنی اور نئے شعور سے اس گھر کی گود اپنے بچوں اور باسیوں کے چلے جانے سے اُجڑ گئی ہے اور وہ درخت پیچھے رہ جانے والے بزرگوں کی قرب انگیز آہوں سے خود ویران ہیں۔

"لکھنا بھی سزا ہے پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے" اس افسانے میں اندھوں کا شہر علامتی تناظر کا حامل ہے۔ یہ "شہر" پابندیوں کی شکار معاشرت اور جبر کی علامت ہے۔ شہر اور اس کے مکین پابندیوں کا شکار ہیں۔ بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونا سب سے بڑی سزا اس لیے ہے کیونکہ اس شہر میں پہلے سے موجود انسانوں پر اس طرح کا تشدد اور ستم کیا جاتا رہا ہے کہ وہ انسانی خصلتوں سے گر کر حیوانی خرافات کا شکار ہوتے گئے۔ اندھوں کے اس شہر کے باسی حقیقت میں اندھے نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس بصارت تو ہے مگر بصیرت جا چکی ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

"جلدی چلے جاؤ۔ کسی نے تمہیں بولتے دیکھ لیا تو مارے جاؤ گے۔ رات کو کچھ بڑبڑا رہے تھے جس سے
صرف مجھے پتا چلا کہ تم بولنا جانتے ہو۔"۴

گفتار پر پابندی اس صورت حال کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اس قابل نہیں رہے کہ جابر کے خلاف بولنے کی کوشش کر سکیں یا اس کے بارے میں سوچ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر عباس نیر کے "شہر" میں زبان ساتھ نہیں دے رہی اور لوگ بولنے کی قوت کھو چکے ہیں۔ مصنف ایک جگہ معاشرے پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسے یہ بھی یاد ہے کہ اندھوں کے شہر کے باسی نہیں جانتے تھے کہ دنیا میں ایسے شہر بھی ہیں جہاں
آنکھوں والے رہتے ہیں۔" ۵

ناصر عباس نیر یہاں اس معاشرے پر طنز کرتے ہیں جہاں حاکم کے شہر میں ظلم و ستم جاری ہے اور بولنے، سوچنے پر بھی پابندی ہے۔ اگر کوئی ان ظالمانہ قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ معروف صوفی شاعر بلھے شاہ بھی اس المیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قصر نام قصور ہے اوتھے مُو نہوں نہ سکن بول
اوتھے سچے گردن ماریئے اوتھے جھُوٹھے کرن کلول۶

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

افسانہ "موت کاروبار ہے" میں بکھراؤ، تباہی، خستہ حالی اور شکست وریخت نمایاں موضوع ہیں۔ یہ افسانہ اس المیے کو بیان کرتا ہے جہاں ایک ماہ اپنے گم ہوئے بیٹے کی لاش کی منتظر ہے اور مسلسل دو سال سے اسی اُمید میں ہسپتال کے چکر لگا رہی ہے کہ وہ اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ سکے۔ یہ انتہائی کربناک داستان ہے کہ ایک ماں صرف اس امید پر زندہ ہے کہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھ سکے۔ اس تباہی پر ناصر عباس کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "اس دنیا کی جیتی جاگتی عورت ایک لاش کی امید کے سہارے زندہ ہے۔ جس دنیا میں جینے کی اُمید لاش ہو وہ دنیا جینے کے قابل کہلانے کا حق رکھتی ہے؟" ۷

مصنف نے اس کہانی کے بیان میں ایسی کئی لاشوں کا ذکر کیا ہے جن کا کوئی وارث نہیں اور وہ بے آسرا ہسپتالوں میں پڑی اور وہاں ڈاکٹر ان پر طنز اور قہقے لگاتے ہیں۔ مصنف یہاں اس معاشرے پر طنز کرتے ہیں کہ معاشرہ کس قدر اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے جو "راکھ" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ وہ "موت" کو کاروبار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ گم ہوئے بیٹوں کے لاشوں کی امید اس معاشرے کی شکست وریخت کو بیان کرتی ہے۔ ناصر عباس کے مطابق "ہم نے سرد خانے، مردہ خانے، قبرستان بنائے ہیں، کوئی عبرت کدہ ہی بنا دیتے۔" ۸

ناصر عباس نیر نے "گدھ" کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ گدھ بھی اس معاشرے کا حصہ ہے جو دوسروں سے ہر طرح کے حقوق چھین رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جینے کا حق بھی چھین لیتے ہیں۔ افسانہ "موت کاروبار ہے" میں جب دو ڈاکٹر آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو وہ لاشوں کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ لاشیں بڑھتی جا رہی ہیں لیکن اٹھانے والے کم تعداد میں موجود ہیں۔ مصنف ایسے معاشرے پر طنز اس انداز میں کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "آئیڈیا اچھا ہے، عبرت کدہ اسی جگہ بنانا چاہیے جہاں بم دھماکہ ہوتا ہے۔ پھر تو اس ملک کے کونے کونے میں عبرت کدے ہوں گے۔ یہی حالات رہے تو پورا ملک ہی عبرت کدہ بن جائے گا۔ وہ دن دور نہیں جب لاشیں زیادہ اور دفنانے والے کم پڑ جائیں گے۔ ایسا وقت آیا تو لوگ لاشیوں کو گدھوں کے حوالے کر کے خود نیند کی گولیاں کھایا کریں گے مگر سنا ہے کہ گدھ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ گدھ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ سارے گدھ اُڑنے والے تھوڑی ہو سکتے ہیں۔" ۹

مصنف نے یہاں اُن لوگوں کو نشانہ بنایا ہے جن کی فطرت اور جبلت میں دوسروں کے حقوق چھیننا شامل ہے۔ ایسے لوگوں کا تعلق ایسے طبقہ اشرافیہ سے ہے جو عام لوگوں کی آواز دبوچ کر اُن کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ اس اقتباس میں صرف وہ پرندہ جو مردار کھاتا ہے وہ نہیں بلکہ آج کے دور میں ہمارے ارد گرد بہت سے ایسے گدھ موجود ہیں جنھوں نے بظاہر تو انسان کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے مگر حقیقت میں یہی گدھ ہیں جن کا ذکر ناصر عباس نیر نے کیا ہے۔ آج کے اس مادیت پرست معاشرے میں انسان جس طرح ایک دوسرے کی

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جان اور مال کے پیاسے ہو چکے ہیں یوں لگتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کے درجے سے گر کر اس درجے پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ان میں اور "گدھ" میں فرق کرنا مشکل ہے۔

ناصر عباس نیر نے اکیسویں صدی کے مسائل اور المیوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ دور جدید میں جسمانی استحصال ایک کاروبار کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔ یہ انسانی استحصال کی سب سے زیادہ قبیح اور المناک صورت ہے جسے جنسی استحصال کہتے ہیں۔ افسانہ "بوڑھے کا قتل" میں جنسی استحصال نمایاں موضوع ہے لیکن یہ افسانہ اس المیے کو بھی سامنے لے کر آتا ہے جو المیہ جنسی استحصال کے بعد جنم لینے والے انسانوں کو زندگی بھر ذلت و رسوائی کے بوجھ تلے دبا کر رکھتا ہے۔ ہر سانس اور ہر لحظہ بدنامی، رسوائی اور ذلت آمیزی کی دلدل میں گزرتا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار نے بھی زندگی کے تیس برس ذلتوں کے اس بھاری طوق کو گلے میں لٹکائے گزاری۔ ان برسوں میں وہ جہاں بطور فوجی کئی محاذوں اور سرحدوں پر تعینات رہا وہاں برابر اپنے وجود کی جنگ کا سامنا بھی کرتا رہا اور یہ کربناک جنگ اسے اس موڑ پر لے آتی ہے جہاں مصنف اپنے قارئین کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ سامنے اور نظر آنے والی جنگ محض ایک چنگاری ہوتی ہے۔ اس جنگ میں وجود کے اندر جلنے والے وہ شعلے ہوتے ہیں جو بالآخر ایک لمبے، نہ ختم ہونے والے اعصاب کے امتحان کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتے ہیں اور کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ افسانے کے مرکزی کردار سے رونما ہو جاتا ہے:

> "اس کی تیس سالہ زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا جسے وہ اپنا جانی دشمن سمجھتا اور جسے ختم کرنے کے لیے اُس کی روح ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوتی۔ ایسے شخص کے لیے گولی چلانا اور گولی کھانا بہت آسان ہوتا ہے۔" ۱۰

بالآخر وہ گولی چلاتا ہے اور اپنی ماں پر بدکاری کی تہمت لگانے والے بوڑھے شخص سے انتقام لیتا ہے جس کے لیے اسے زندگی کے تیس برس انتظار کرنا پڑا۔

جنسی استحصال کی مختلف پرتیں اس افسانے میں کھولنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے کہ کیسے معاشی مجبوریاں اور وقت گزارنے کی لاچاریاں اس موڑ پر لے آتی ہیں کہ انسان اپنا جسم دوسروں کے لیے بے بسی کے عالم میں پیش کر دیتا ہے۔ بوڑھے کو قتل کرنے کے بعد جب فوجی سرحد پر ان دیکھے دشمن کے میزائل سے شہید ہو جاتا ہے تو کہانی یوں ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سال بھر کے جھگڑے کے بعد اس شہید کی بیوہ کی پینشن اس کے ساس سسر اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسے ہفتے میں دو بار آدھی رات گھر سے باہر گزارنی پڑتی تھی۔ سحری کے وقت جب اس کی ڈیڑھ سال کی بیٹی دودھ پیتی تو وہ بار بار اپنی چھاتی کو نلکے کے تازہ پانی سے دھوتی تھی اور روتی تھی کہ وہ کس کے لیے اور کس کے خلاف جنگ کر رہی تھی اپنے طریقے سے؟ اپنے طریقوں سے لڑی

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

گئی جنگوں میں ہے ہو دگی ہو کر رہتی ہے۔ کل اس کے بیٹے کو کوئی نہ کوئی بتائے گا کہ... عورتوں کے راز جلد افشا ہونے کے لیے ہوتے ہیں... جن چھاتیوں کا اس نے دودھ پیا ہے اس پر کتنے ہونٹوں کے نشان ہیں تو وہ کس کے خلاف جنگ کرے گا؟ بتانے والے کے خلاف؟ ماں کے خلاف؟ دادا، دادی کے خلاف؟ یا اپنے خلاف؟ وہ اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ اسے جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔" ۱۱

بعض اوقات حالات ہی کچھ اس قسم کے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی جنگ کا سامنا رہتا ہی ہے۔ چاہے وہ جنگ نہیں بھی لڑنا چاہتا لیکن یہ سماج اسے مجبور کر دیتا ہے جیسا کہ اس افسانے میں بتایا گیا ہے۔

جبر کو ادیبوں نے ہر دور میں موضوع بحث بنایا ہے اور ہر دور کے ادب میں انسانوں پر ہونے والے جبر اور آپس کی مختلف صورتوں کی صدائے بازگشت ادب میں سنائی دیتی رہی ہے۔ "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں ناصر عباس پاکستانی معاصر عہد اور سماج کو زیر بحث لائے ہیں۔ موجودہ سماجی پابندیوں، گھٹن، شخصی آزادیوں پر قدغن اور خاص طور پر کرداروں کی تخلیق میں وہ قدم قدم پر قاری کی اس طرف توجہ دلانے کی سعی کرتے ہیں جہاں افسانوی کردار جبر اور جبر کی مختلف صورتوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لاچاری، مجبوری اور کسمپرسی کے شکار جو کردار کم و بیش ہر افسانے میں دکھائی دیتے ہیں اس کی وجہ جبر ہے۔

"راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں جبر کی متعدد صورتیں سامنے آئی ہیں۔ "ریاستی جبر" ان افسانوں میں جابجا دکھائی دیتا ہے جہاں اس ریاست میں رہنے والوں پر ظلم و ستم اور جبر سے کام لیا جاتا ہے اور انسانی استحصال کرنا وہاں کے بادشاہ کا شیوہ بن جاتا ہے۔ ریاستی جبر کی مثال اگر دیکھی جائے تو بعنوان "سب سے پرانی قبر ہی پھانسی سے بچا سکتی ہے۔" میں جب بادشاہ ایک بستی کو فتح کرتا ہے تو اس بستی میں مکین لوگوں کا استحصال کس طرح کرتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

"حاکم نے جس وقت ہماری بستی فتح کی تھی اس وقت بستی میں بس چار آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ پہلے انھی کے سر کاٹے گئے حالانکہ ان میں سے کسی نے ہتھیار نہیں اُٹھائے تھے۔" ۱۲

ریاستی جبر کی مثالوں سے یہ مجموعہ بھرا پڑا ہے۔ اس جبر کی انتہا یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگوں کو اس حد تک مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اُنھیں خدا ماننے پر مجبور ہوں۔ "سماجی جبر" بھی ان افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے جس میں سماج کے اندر سے لوگ ایک دوسرے پر جبر کر کے ایک دوسرے کا استحصال کرتے ہیں۔ افسانہ "موت کا کاروبار ہے" میں ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر علی کی گفتگو اس بات کی گواہی ہے کہ معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے نفرت، حسد، بغض، کینہ سبھی کچھ رکھتا ہے ماسوائے پیار، امن بھائی چارے کے۔ ناصر عباس نیر اسی زمینی تناظر میں لکھتے ہیں:

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"موت ایک بزنس ہے۔ لاشیں اس بزنس کا سکہ ہیں۔ جس دھماکے میں تین بے نام لوگ مارے گئے اس سے کتنوں کو فائدہ ہوا؟ یہ جاننے کے لیے بس یہ دیکھیے کہ کس کو کس کی مد میں کتنے فنڈز جاری ہوئے؟ کہاں سے کس کو امداد ملی؟ کس کی دکان پر رش بڑھا؟ کن لوگوں نے افسوس کے وقت تصویریں بنوائیں اور ٹکر چلوائے؟ جب یہ بزنس ہو چکا تو یہ تین لاشیں... تین بے نام بے چہرہ لوگ... کھوٹے سکے بن گئے۔ بے کار بوجھ۔ ان کی قبر پر تختی ہو گی نہ کوئی فاتحہ۔"۱۳

"آزادی رائے پر پابندی" یہ بھی جبر کی ایک قسم ہے۔ اسے ناصر عباس نیر نے افسانوی مجموعے میں شامل کیا ہے بعنوان افسانہ "کچھ لکھنا چاہیں تو بھی نہ لکھ پائیں" اور "لکھنا بھی سزا ہے پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے" میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ مصنف کے نزدیک کسی کے زیر اثر رہ کر لکھنا بہت کٹھن کام ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ اس کے لیے ہی لکھا جانا چاہیے مگر شہر کے نئے باسی نے اس سے ذرا ہٹ کر لکھا جس پر افسانے کا اختتام ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس شہر میں قیام کی اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اس دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس نے پہلے سوچا کہ وہ اندھوں اور گونگوں کے شہروں کا مختصر احوال لکھے گا۔ پھر یہ سوچ کر اتنا لکھا۔ لکھنا بھی سزا ہے پر کسی بادشاہ کے شہر میں ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے۔"۱۴

اس اقتباس یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان ہونا تو سزا ہے ہی مگر حاکم وقت کے شہر میں رہ کر اس کے پابند ہو کر لکھنا سب سے بڑی سزا ہے۔

ناصر عباس نیر کے ہاں ڈر اور خوف بھی اہم موضوع ہے۔ افسانہ "یہ خدا کہاں نہیں رہتے؟" میں ایک کردار کو بادشاہ کے سپاہی گرفتار کر لیتے ہیں۔ جب وہ گرفتاری دے چکا ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں ڈر اور خوف کے باعث کئی سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب وہ خود سے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی سبب خوف اور ڈر کی لہر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا خود سے سوالات کرنے کا آغاز بھی اسی وجہ سے ہوتا ہے۔ ناصر عباس لکھتے ہیں:

"مجھے دنیا کی سب سے کڑی سزا کا سامنا ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ میں اس جگہ ہوں جہاں وقت روک دیا گیا ہے۔ کیا میں موت سے آزاد ہو گیا ہوں؟ اس نے خود ہی سے سوال کیا۔ موت سے آزادی کڑی سزا ہے۔" ۱۵

یہاں یہ کردار ڈر اور خوف سے بے بس تھا جس کی وجہ سے وہ خود سے طرح طرح کے سوال سوچ رہا تھا۔ اس کا ڈر اسے اس حد تک سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ لوگ اسے مار ہی ڈالیں گے۔

Vol.4 No.4 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ایک اور افسانہ ''نکاح ٹوٹ سکتا ہے قسم نہیں'' میں ایک ایسا کردار سامنے آتا ہے جسے ان دیکھا خوف پریشان کر رہا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ماں سے پہلے بھی کوئی شادی کر چکا ہے تو یہ زیادہ خطرناک ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ایک خط کے ذریعے ان کے پورے حالات و احوال سے آگاہ کر دیا۔ یہ سوال اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے جس سے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کا اظہار مصنف نے کچھ یوں کیا ہے:

''ابا یہ جانتے ہوئے بھی پر سکون ہیں۔ کیا وہ اماں سے اتنی محبت کرتے ہیں؟ اماں کے دل میں شمس اب تک بستا ہو گا؟ یہ سوچتے ہی وہ مجھے اماں نہیں امیر اں لگتی ہیں جس کے تعلق سے میں اپنے جذبات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ تے نہیں سکتا۔ وہ خط آخر کس نے لکھا ہو گا؟... یہ سوال مسلسل تنگ کرتا ہے۔'' ۱۶

یہ ڈر خوفناک اور بھیانک ہے جس میں ایک بیٹا اپنی ماں کے بارے اتنا سوچ رہا ہے۔ یہ ڈر سماج کا خوف تھا۔ وہ یہ ڈر تھا کہ یہ لوگ جو ابھی اس قصے کو نہیں جانتے اگر جان گئے تو بدنامی و ذلت تو ضرور ہو گی۔ یہی ڈر اسے طرح طرح سے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو نہ صرف یہ اکیلا کردار بلکہ ہم سب خوف کی کسی نہ کسی شکل کے حصار میں قید ہیں۔ یہ خوف کبھی باہری دنیا کا ہوتا ہے اور کبھی ہمارے اندر کا پیدا کردہ۔

مختصر یہ کہ ناصر عباس نیر کا شمار موجودہ دور کے اُن نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمارے معاصر عہد اور زوال پذیر اخلاق و معاشرت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ''راکھ سے لکھی گئی کتاب'' میں اُنھوں نے مختلف علامتوں کا سہارا لے کر معاشرتی و اخلاقی کمزوریوں کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام افسانے ہمارے آج کے دور میں جی رہے انسانوں کی زندگیوں کی مختلف کیفیات اور حالات کے آئینہ دار ہیں۔ یہ انسان ڈر، خوف، جبر، تشدد، منافقت، فریب و ریاکاری، مادیت پرستی، بھوک اور جسم و حوس کی نہ ختم ہونے والی بھوک اور غربت وافلاس کے لامحدود سائے میں جی رہے ہیں اور زندگی کو بطور سزا کاٹ رہے ہیں۔ یہی مسائل موجودہ دور میں ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔

فنی اعتبار سے بھی ناصر عباس نیر نے اس کتاب کو لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ افسانوں کے اسلوب میں طنز کے نشتر واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ کردار نگاری، منظر نگاری، سماجی ماحول، پلاٹ اور زبان و بیان کے حوالے سے یہ مجموعہ اس صدی کی نمائندہ تخلیقات میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ یقیناً ناصر عباس نیر کی شاندار ادبی کاوش ہے۔

حوالہ جات

1. https:// youtube./ i unfqu8gy co
۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، راکھ سے لکھی گئی کتاب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۱۱۔
۳۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، راکھ سے لکھی گئی کتاب، ص:۱۱

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.4 2021

۴۔ ایضاً، ص:۶۲۔

۵۔ ایضاً، ص:۵۹۔

۶۔ بلھے شاہ، آکھیا بلھے شاہ نے، مرتبہ: محمد آصف خاں، لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۲۰۰۶ء، ص:۴۹۴۔

۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، راکھ سے لکھی گئی کتاب، ص: ۱۱۰۔

۸۔ ایضاً، ص:۱۰۴۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۳۶۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً، ص:۵۷،۵۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۱۴۔

۱۴۔ ایضاً، ص:۶۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص:۱۱۹،۱۱۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص: ۹۰،۹۱۔